ہاں تو اس بینک کو کیا کروں؟ کوئی چھوٹا موٹا معاملہ ہوتا تو کہتا لاؤ۔ جہاں اور سر پر بہت سے بوجھ ہیں۔ وہاں اتنا اور سہی، پر دس لاکھ بہت ہوتے ہیں پچاس ہزار سود کے الگ ہوئے۔ اور پھر مہاجنوں کے بھی تو تین لاکھ روپے آتے ہیں ریاست کی آمدنی ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ سالانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ میں اتنا بڑا حوصلہ کروں بھی تو کس برتے پر؟ ہاں اگر فقیری اختیار کر لوں۔ تو البتہ شاید میری زندگی میں (بشرطیکہ ناگہانی موت نہ آجائے) یہ قضیہ پاک ہو سکے۔ اس آنچ میں کودنا اپنی ساری زندگی کو۔ اپنے حوصلوں کو، آرزوؤں کو خاکستر کرنا ہے۔ آہ! اس دن کے انتظار میں ہم نے کیا کیا مصیبتیں نہیں جھیلیں۔ والد صاحب نے اسی کوفت میں جان دی۔ یہ روز سعید ہمارے ایام تاریک کی دور افتادہ مشعل تھی۔ ہم اسی کے چہچے رہتے تھے۔ اس سے دل کو کتنی تقویت کتنا غرور تھا۔ فاقہ کشی میں ہمارے تیور نہ میلے ہوتے تھے۔ جب صبر و انتظار کے بعد ایام نیک آئے۔ تو میں اس سے بے رخی کیونکر کروں؟ زندگی کی تمناؤں پر پانی کیونکر پھیروں؟ اور کچھ اپنی ذاتی تمناؤں تک تو خاتمہ نہیں۔ ریاست کی ترقی اور اصلاح کی کتنی تجویزیں دل میں قائم کر چکا ہوں۔ کیا اپنی تمناؤں کے ساتھ ان تجویزوں کو بھی ڈبو دوں؟ اس کمبخت رانی نے مجھے بڑی طرح پھانسا ہے جب تک زندہ رہی کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ میری تو تباہی کا سامان کر گئی! مگر میں افلاس سے اتنا ڈرتا کیوں ہوں؟ افلاس کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر میری آرزوؤں کا خون۔ اگر میری زندگی کی قربانی ہزاروں خاندانوں کو تباہی اور خستہ حالی سے بچا لے۔ تو مجھے اس قربانی سے دریغ نہ ہونا چاہیے۔ آسائش سے زندگی بسر کرنا ہی تو ہماری زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ کیا یہ تسکین کا باعث نہیں ہے کہ میری خانہ ویرانی صدہا

گھروں کی آبادی کا وسیلہ ہو؟ ہماری عزت اور شہرت اور یادگار ہماری تن آسانیوں سے نہیں ہوا کرتی۔ محلوں میں رہنے والے اور دنیا کی نعمتوں کا لطف اٹھانے والے رانا پرتاپ کو کون جانتا؟ یہ اس کی تکلیفیں۔ اس کی قربانیاں، اس کی فاقہ کشیاں ہیں جنہوں نے اسے ہماری قوم کا آفتاب بنا دیا ہے۔ رام چندر نے اگر اپنی زندگی عیش و عشرت میں بسر کی ہوتی۔ تو آج ہم ان کا نام بھی نہ جانتے۔ ان کی قربانیوں ہی نے انہیں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ ہماری عظمت ہماری دولت اور ہمارے سامانِ عیش سے بے نیاز ہے۔ میں موٹر پر سوار ہوا تو کیا۔ اور ٹٹو پر سوار ہوا تو کیا؟ ہوٹل میں ٹھہرا تو کیا؟ بہت ہوگا۔ میرے تعلقہ دار بھائی مجھ سے کنارہ کش رہیں گے میرے حوالی موالی مجھ سے الگ ہو جائیں۔ اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ میں تو دل سے چاہتا ہوں۔ کہ ان لوگوں سے الگ تھلگ رہوں۔ اگر محض اتنی تکلیف سے صدہا خاندانوں کا بھلا ہو جائے۔ تو میں انسان نہیں ہوں۔ اگر اسے شوق سے قبول نہ کروں۔ اگر اپنے گھوڑے اور فٹن سیر و شکار، نوکر چاکر اور زمانہ ساز اعزہ و آتش خواروں سے محروم ہو کر میں ہزاروں امیر و غریب خاندانوں کا بیواؤں کا۔ یتیموں کا بھلا کر سکوں تو مجھے اس میں مطلق تامل نہ ہونا چاہیے، ہزاروں خاندانوں کی قسمت اس وقت میری مٹھی میں ہے۔ میری تن پروری ان کا زہر قاتل اور میری نفس کشی ان کا آبِ حیات ہے۔ میں آبِ حیات بن سکتا ہوں۔ تو زہر قاتل کیوں بنوں۔ اور پھر اسے نفس کشی سمجھنا بھی میری زیادتی ہے۔ یہ بالکل اتفاقی امر ہے۔ کہ میں آج اس جائداد پر قابض ہوں۔ میں نے اسے کمایا نہیں، حاصل نہیں کیا۔ اس کے لیے خون نہیں گرایا پسینہ نہیں بہایا۔ اگر مجھے یہ جائداد نہ ملتی۔ تو آج اپنے لاکھوں بھائیوں کی طرح میں

بھی فکر معاش میں مصروف ہوتا، میں کیوں نہ بھول جاؤں۔ کہ میں اس ریاست کا مالک ہوں۔ ایسی ہی آزمائشوں میں انسانیت کی پہچان ہوتی ہے میں نے برسوں کتب بینی کی۔ برسوں انسانی فلاح کے اصول قائم رہا۔ یقیناً یہ میری انتہا درجہ کی بزدلی، نفس پرستی ہے۔ اگر اس موقع پر میں ان تمام اصولوں کو بھلا دوں۔ خود غرضی کو انسانیت اور اخلاق پر غالب آجانے دوں۔ خود غرضی کا سبق سیکھنے کے لیے مجھے گیتا اور مل اور النسیں اور ارسطو کے شاگرد بننے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ سبق تو مجھے اپنے دوسرے بھائیوں سے مفت مل جاتا۔ عام رواج سے بہتر اور کون استاد تھا؟ عام آدمیوں کی طرح میں بھی خود غرضی اور ہوس پرستی کے آگے سر جھکا دوں۔ تو پھر خصوصیت کہاں رہی؟ نہیں میں کنونشن (رواج) کی غلامی نہ کروں گا۔ جہاں ثواب کر سکتا ہوں، عذاب نہ کروں گا۔ جہاں دُعا مل سکتی ہے۔ آہ نہ لوں گا۔ ایشور! تم میری مدد کرو، تم نے مجھے راجپوت کے گھر پیدا کیا ہے۔ میری ذات سے اس جانباز قوم کو شرمندہ مت کرو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ گردن خود غرضی کے آگے نہ جھکے گی۔ میں رام اور بھیشم اور پرتاپ کا جانشین ہوں۔ تن پروری کا غلام نہ بنوں گا۔ نفس کی اطاعت نہ کروں گا۔

کنور جگدیش سنگھ کو اس وقت ایسا احساس ہوا۔ گویا وہ کسی اونچے مینار پر چڑھ گئے ہیں۔ دل میں امنگ آگئی۔ آنکھیں روشن ہوگئیں۔ مگر ایک ہی لمحہ کے بعد اس امنگ کا اتار ہونے لگا۔ اونچے مینار سے نیچے کی طرف آنکھیں گئیں۔ سارا جسم کانپ اٹھا۔ سر میں چکر سا آگیا۔ اس آدمی کی سی حالت ہوئی جو کسی ندی کے کنارے بیٹھا ہوا۔ اس میں کودنے کا ارادہ کر رہا ہو۔

انہوں نے سوچا، کیا میرے گھر کے لوگ مجھ سے متفق ہو بھی جائیں تو مجھے مجاز کہ اپنے ساتھ ان کی تمناؤں کا بھی خون کردوں؟ اور تو اور ماتا جی کبھی نہ مانیں گے اور غالباً بھائی لوگ بھی گریز کریں۔ ریاست کی حیثیت کے لحاظ سے وہ کم سے کم دس ہزار سالانہ کے مستحق ہیں۔ اور ان کے حق کو میں کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میں صرف اپنی ذات کا مختار ہوں۔ مگر میں بھی تو تنہا نہیں ہوں۔ سادتری آپ چاہے میرے ساتھ آگ میں کودنے کو تیار ہو جائے۔ مگر اپنے پیارے لختِ جگر کو کبھی اس آنچ کے قریب نہ آنے دے گی۔

کنور صاحب نہایت خطرناک زمین پر قدم رکھ رہے تھے۔ اور ہر ایک قدم انہیں بلاتا تھا۔ کہ آگے مت بڑھو، انہوں نے اپنے چھوٹے بچے کو بڑے ناز و نعمت سے پالا تھا۔ نکبت و ادبار کے زمانہ میں بھی اس کی پرورش میں کوئی کمی نہ ہونے پائی تھی۔ کنور صاحب خود چاہے بیل گاڑیوں پر بیٹھنے کے لیے مجبور ہوں۔ مگر یہ نوبت کبھی نہیں آئی کہ لڑکے کی سواری میں ٹانگن نہ رہا ہو، امارت و ریاست کا غرور اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا۔ سادتری اسے ہمیشہ راجہ صاحب کہا کرتی چار سال کا نادان بچہ غرور اور تمکنت کا پتلا بن گیا تھا۔ اس کی پیشانی سے اقبال کا نور جھلکتا تھا۔ اس کے انداز میں ایک تحکم اور باتوں سے ایک خودسری کی شان ٹپکتی تھی۔ کیا باغ ریاست کی اس زینت کو باد حوادث کا نشانہ بننے دوں؟ کون سامنہ لے کر سادتری سے یہ باتیں کہوں گا۔ اجب سے شادی ہوئی ہے۔ اس غریب کو کبھی نہ کبھی سحر ہو گی۔ اور جب کہ سحر ہو گئی۔ سوئی ہوئی خواہشیں بیدار ہوئیں۔ خوشیوں کے چہکنا شروع کیا، تو یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ وہ سحر شبِ غم سے بھی زیادہ تاریک ہو۔ جہاں امید

کے ستارے بھی نہیں چمکتے۔ جہاں وہ رات کی ٹھنڈک نہیں، شبنم نہیں۔ وہ جان بخش نیند نہیں۔ وہ پُرمزہ خواب نہیں۔ وہ کیفیت انگیز سکوت نہیں۔ یہ ستم ہے، قہر ہے!

کنور صاحب اور زیادہ نہ سوچ سکے۔ وہ ایک سراسیمگی کی حالت میں پلنگ پر سے اٹھ بیٹھے۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ذرا دیر کے بعد انہوں نے جنگلے کے باہر کی طرف جھانکا۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ چاروں طرف اندھیر تھا۔ ان کی پریشانیوں کی طرح بے انتہا اور عمیق سامنے گومتی ندی بہتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ندی کے کنارے چلے گئے۔ اور دیر تک وہاں ٹہلتے رہے۔ دل مضطر کو امواج دریا سے کوئی مناسبت ہے۔ شاید اس لیے کہ لہریں بھی مضطرب ہیں۔

انہوں نے اپنے بہکتے ہوئے خیالات کو پھر مجتمع کیا۔ اگر ریاست کی خالص آمدنی سے یہ وثیقے دیئے جائیں گے۔ تو فرض کا سود نکلنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ اصل کا ذکر ہی کیا۔ کیا آمدنی میں اضافہ نہیں ہو سکتا؟ ابھی اصطبل میں بیس گھوڑے ہیں میرے لیے ایک کافی ہے۔ ملازموں کی تعداد سو سے کم نہ ہوگی۔ میرے لیے دو کافی سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ یہ انسانیت سے بعید ہے۔ کہ اپنے ہی بھائیوں سے ذلیل خدمتیں کرائی جائیں۔ ان آدمیوں کو میں اپنی سیر کی زمین دے دوں گا۔ آرام سے کھیتی کریں گے۔ اور مجھے دعائیں دیں گے۔ باغیچوں کے پھل اب تک ڈالیوں اور تحفوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اب انہیں فروخت کر دوں گا۔ اور سب سے بڑی رقم تو بیجائی کی ہے صرف مہیش گنج کے بازار سے دس ہزار روپے وصول ہوتے ہیں۔ یہ سب رقم مہنت جی ہضم کر جاتے ہیں۔ ان کے لیے ایک ہزار روپے سال کافی ہونے چاہئیں

اب کی اس بازار کا ٹھیکہ کر دوں گا۔ آٹھ ہزار سے کم نہ لیں گے۔ ان مدّوں سے پچیس ہزار سالانہ کی نکاسی ہو سکتی ہے۔ ساوتری اور للّا (لڑکا) کے لیے ایک ہزار روپیہ ماہوار بہت ہے۔ میں ساوتری سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ یا تو ایک ہزار روپیہ ماہوار لو، اور مجھے چھوڑ دو۔ رانی بننے کی ہوس ہے۔ تو شوق سے بنو۔ مگر میں راجہ نہ بنوں گا۔

دفعتہً کنور صاحب کے کانوں میں آواز آئی۔ رام نام ست ہے"۔ انہوں نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ کئی آدمی سڑک پر ایک لاش لیے آتے تھے۔ ان لوگوں نے ندی کے کنارے چتا بنائی اور آگ لگا دی۔ دو عورتیں بَین کر کے رو رہی تھیں۔ اس بَین کا کنور صاحب کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ دِل میں شرمندہ ہو رہے تھے۔ کہ میں کتنا سنگدل ہوں۔ ایک غریب آدمی کی لاش جل رہی ہے۔ عورتیں رو رہی ہیں اور میرا دل ذرا بھی نہیں پسیجتا۔ پتھر کی مورت کی طرح کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ یکایک ایک عورت نے روتے ہوئے کہا۔ "ہائے میرے راجہ! تمہیں بس کیسے میٹھا لگا"۔ یہ دلخراش بَین سنتے ہی کنور صاحب کے جگر میں ایک ٹھیس سی لگ گئی۔ بے اثری کا برف پھٹ گیا۔ رقت اُمڈ آئی۔ اور آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔ غالباً اس غریب نے زہر کھا کر جان دی ہے۔ ہائے اسے زہر کیسے میٹھا لگا! اس میں کتنا درد ہے۔ کتنی حسرت، کتنی حیرت! زہر تو کڑوی چیز ہے۔ وہ کیونکر میٹھی ہو گئی۔ زہر تلخ کے بدلے جس شخص نے جانِ شیریں دے دی۔ اس پر کوئی بڑا سانحہ آیا ہو گا۔ ایسی ہی حالت میں زہر میٹھا ہو سکتا ہے۔ ان چند لفظوں میں تاثیر درد کا ایسا جادو بھرا ہوا تھا۔ کہ کنور صاحب تڑپ گئے۔ یہی صدائیں بار بار ان کے تارِ جگر میں گونجتی تھیں۔ ان

میں انہیں معنی و جذبات کا ایک دفتر چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب ان سے وہاں کھڑا رہا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ان سوگواروں کے پاس آئے، اور ایک آدمی سے پوچھا۔ "کیا بہت دنوں سے بیمار تھے؟" اس آدمی نے کنور صاحب کی طرف ایک حسرت ناک انداز سے دیکھا، اور بولا "نہیں صاحب کہاں کی بیماری، ابھی آج شام تک مزے میں باتیں کر رہے تھے۔ معلوم نہیں شام کو کیا کھا لیا۔ کہ خون کی قے آنے لگی۔ جب تک حکیم صاحب کے یہاں جائیں۔ تب تک آنکھیں الٹ گئیں، نبض چھوٹ گئی۔ حکیم صاحب آکر دیکھا، تو کہا، اب کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے زہر کھا لیا۔ بس صاحب گھر رونا پیٹنا ہونے لگا۔ ابھی کل بائیس تیئیس سال کی عمر تھی۔ ایسا ہٹھا سارے لکھنؤ میں نہیں تھا۔

کنور "کچھ معلوم نہیں ہوا۔ زہر کیوں کھایا؟"

اس آدمی نے خشتہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ صاحب اور تو کوئی بات نہیں ہوئی جب سے یہ بڑا بینک ٹوٹا ہے۔ بہت اداس رہتے تھے۔ کئی ہزار روپے بینک میں جمع کیے تھے۔ گھی، دودھ، ملائی کی بڑی دکان تھی۔ برادری میں مان تھا۔ وہ ساری جمع ڈوب گئی۔ ہم لوگ منع کرتے تھے۔ کہ بینک میں روپیہ نہ رکھو، مگر صاحب ہو ہی تو یہ تھی۔ کہ کسی کی نہیں سنی۔ آج صبح بیوی سے گہنے مانگنے تھے۔ کہ گرو رکھ کر ہیروں کو دودھ کا دام دیں۔ اس سے باتوں باتوں میں تکرار ہو گئی۔ بس صاحب نہ جانے کہاں سے زہر لا کر کھا لیا۔

کنور صاحب کے جگر میں ایک رعشہ سا آ گیا۔ معاً خیال گزرا۔ شیو داس تو نہیں ہے پوچھا "کیا ان کا نام شیو داس تو نہیں تھا؟" اس آدمی نے حیرت سے دیکھ کر

کہا۔ "ہاں صاحب یہی نام تھا، آپ سے جان پہچان تھی کیا؟"

کنور۔ "ہاں ہم اور وہ بہت دنوں تک برہل میں ساتھ کھیلے تھے۔ آج شام کو وہ ہم سے بنک گھر کے احاطے میں ملے تھے۔ اگر انہوں نے مجھ سے ذرا بھی ذکر کیا ہوتا۔ تو میں حتی الامکان ان کی مدد کرتا، افسوس"۔

اس آدمی نے اب کنور صاحب کو غور سے دیکھا۔ اور جاکر عورتوں سے بولا۔ "چپ ہو جاؤ، برہل کے راجہ صاحب آئے ہیں"۔ اتنا سنتے ہی شیوداس کی ماں نے زور زور سے سر پیٹا۔ اور روتی ہوئی آکر کنور صاحب کے پیروں پر گر پڑی۔ اس کی زبان سے صرف یہ الفاظ نکلے "بیٹا بچپن میں تم اسے بھیا کہا کرتے تھے۔۔۔۔۔" اور گلا پھنس گیا۔ کنور صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ شیوداس کی تصویر ان کے سامنے کھڑی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر دوستانہ بے تکلفی اور خلوص کی جگہ ایک شکوۂ بے کس تھا۔ جو زبان حال سے کہہ رہا تھا۔ تم نے دوست ہو کر میری جان لی"۔

(۷)

صبح ہو گئی۔ مگر کنور صاحب کی آنکھیں خواب سے آشنا نہ ہوئیں۔ جب سے وہ گومتی کے کنارے سے لوٹے تھے۔ ان کے دل پر ایک ویراگ سا چھایا ہوا تھا۔ وہ رقت انگیز نظارہ نفس کی خود غرضانہ دلیلوں کے لیے دیوارِ آہن بنا ہوا تھا۔ اس نے تزلزل کو استحکام کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ ساوتری کی دل شکنی، للا کی مایوسانہ ضد اور ماں کی زبان جیسے ارادہ شکن اسلحہ اس دیوارِ آہن سے سر ٹکرا کرنا کام چلے جاتے تھے۔ ساوتری کڑھے گی کڑھے، للا کو کشمکشِ حیات میں کودنا پڑے گا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ اماں جان دینے پر آجائیں گی۔ بہتر ہے، میں اپنے زن و فرزند، خویش و برادر

کے لیے ہزاروں خاندانوں کا خون نہ کروں گا۔ آہ! شیدا داس کو زندہ دیکھنے کے لیے مَیں ایسی ایسی کئی ریاستیں نثار کر سکتا ہوں۔ ساوتری کو فاقہ کرنا پڑے۔ للّا کو مزدوری کرنا پڑے۔ مجھے در بدر بھیک مانگنا پڑے۔ تب بھی دوسروں کا گلا نہ دباؤں گا۔ اب دیر کرنے کا موقع نہیں، معلوم نہیں آج کل یہ خانہ برباد یاتی کون سے پہلو اختیار کریں۔ کیا کیا ستم ڈھائیں۔ مجھے اتنا پس و پیش کیوں ہو رہا ہے محض نفس کی کمزوری ہے۔ ورنہ کوئی ایسا بڑا کام نہیں جو کسی نے نہ کیا ہو۔ آئے دن لوگ لاکھوں روپے خیرات کرتے رہتے ہیں۔ ابھی ابھی بہار کے ایک راجہ نے اپنی بارہ لاکھ سالانہ نفع کی جائداد تعلیم نسواں کے لیے وقف کر دی ہے۔ مَیں اتنا پست ہمت کیوں ہو جاؤں؟ میں اتنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس سے کیوں منہ موڑوں جو کچھ ہو چاہے سر پر جو کچھ پڑے۔ اس کی کیا فکر؟ گھنٹی بجائی، ایک لمحہ میں اردلی آنکھیں ملتا ہوا حاضر ہوا۔

کنور صاحب بولے، "ابھی جیکب صاحب بالشٹر کے پاس جا کر میرا سلام دو۔ جاگ گئے ہوں گے۔ کہنا نہایت ضروری کام ہے۔ نہیں یہ رقعہ لیتے جاؤ۔ موٹر تیار کرا لو"۔

(۸)

مسٹر جیکب نے کنور صاحب کو بہت سمجھایا کہ آپ اس دَل دَل میں قدم نہ رکھئے۔ ورنہ نکلنا محال ہو جائے گا۔ معلوم نہیں ابھی اور کتنی ایسی رقمیں ہیں جن کی آپ کو خبر نہیں ہے۔ آپ کی جانب سے اعلان ہوتے ہی سب اپنے اپنے دعوے پیش کریں گے اور آپ کو سبھی دعوے قبول کرنے پڑیں گے۔ اس وقت آپ کسی کو

مستثنیٰ کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ مگر دل میں قائم ہونے والا فیصلہ چونے کا فرش ہے۔ جسے نمائش کے تھپیڑے کمزور کرنے کے بجائے اور بھی مضبوط کر دیتے ہیں۔ کنور صاحب اپنے فیصلے پر قائم رہے اور دوسرے دن اخباروں میں اعلان کر دیا کہ ہم بر ہل کی رانی صاحبہ مرحومہ کی کل مالی ذمہ داریوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور معیاد وعدہ کے اندر انہیں ادا کر دیں گے۔

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی سارے لکھنؤ میں ہل چل ہو گئی۔ باخبر لوگوں کی رائے میں یہ کنور صاحب کی صریح حماقت تھی۔ اور جو لوگ قانون سے بے خبر تھے۔ انہوں نے خیال کیا۔ کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے۔ ایسے بہت کم آدمی تھے۔ جنہوں نے کنور صاحب کی نیت کی صفائی اور اخلاقی احساس کی داد دی ہو۔ مگر داد چاہے نہ ملی ہو۔ دعاؤں کی کمی نہ تھی۔ بینک کے ہزاروں غریب معاملہ دار سچے دل سے کنور صاحب کو دعائیں دے رہے تھے۔

ایک ہفتہ تک کنور صاحب کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملی۔ مسٹر جیکب کا خیال درست نکلا۔ مطالبات کی فہرست روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کتنے ہی پرونوٹ ایسے ملے۔ جن کا انہیں مطلق علم نہ تھا۔ جوہریوں اور دوسرے بڑے بڑے دکانداروں کی یادفتی بھی کم نہ تھی۔ تخمینہ تیرہ چودہ لاکھ کا تھا۔ میزان بیس لاکھ کے قریب جا پہنچا۔ کنور صاحب گھبرائے، اندیشہ ہوا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ مجھے اپنے بھائیوں کو بھی وثیقہ سے محروم کرنا پڑے۔ جس کا انہیں کوئی مجاز نہ تھا۔ یہاں تک کہ ساتویں دن انہوں نے کئی دکانداروں کو سخت سست کہہ کر سامنے سے دور کر دیا۔ جہاں سرح سود زیادہ تھی۔ اس کی تخفیف کروائی۔ اور انقضاء میعاد کی قید سے فائدہ اٹھانے میں مطلق

تامل نہ کیا۔ انہیں مہاجنوں کی سخت گیری پر غصہ آتا تھا۔ ان کے خیال میں مہاجنوں کو ڈوبتی ہوئی رقم کا ایک حصہ مل جانے پر بھی اپنی تقدیر کا شکور ہونا چاہیے تھا۔ ان جنہ رسیوں کے باوجود کل مطالبات کی میزان انیس لاکھ سے کم نہ ہوگی۔

کنور صاحب ان کاموں سے فرصت پاکر ایک روز انڈسٹریل بینک کی طرف جا نکلے۔ بینک کھلا ہوا تھا۔ تنِ مُردہ میں جان آگئی تھی۔ اس کا تنفس جاری ہوگیا تھا۔ بازکش معاملہ داروں کا ہجوم تھا۔ لوگ خوش خوش جا رہے تھے۔ کنور صاحب کو دیکھتے ہی صدہا آدمی فرط عقیدت سے ان کی طرف دوڑے۔ اور کسی نے رو کر، کسی نے ان کے قدموں کو بوسہ دے کر، کسی نے زیادہ مہذب طریق سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بنک کے عملوں سے بھی ملے۔ لوگوں نے کہا کہ اس اعلان نے بینک کو زندہ کر دیا۔ بنگالی بابو نے سابق مینجر لالہ سائیں داس پر گل افشانی شروع کی۔ وہ سمجھتا تھا۔ دنیا میں سب آدمی بھلا مانس ہے۔ ہم کو نصیحت کرتا تھا۔ اب اس کا آنکھ کھل گیا ہے۔ اکیلا گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ کسی کو منہ نہیں دکھاتا۔ ہم سنتا ہے۔ وہ یہاں سے بھاگ جاتا تھا۔ پر بڑا صاحب بولا، تم بھاگے گا۔ تو ہم لوگ تمہارے اوپر وارنٹ جاری کر دے گا۔" اب سائیں داس کی جگہ بنگالی بابو مینجر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد کنور صاحب برہل آئے۔ بھائیوں نے یہ قصہ سنا۔ تو بگڑے، اور قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی۔ ماتا جی کو ایسا صدمہ ہوا۔ کہ وہ اسی دن بیمار ہوگئیں۔ اور ایک ہی ہفتہ میں مایوس و الم زدہ اس دنیائے اسباب سے رخصت ہوگئیں۔ سادتری کو بھی چوٹ لگی۔ پر اس نے محض صبر ہی نہیں کیا۔ بلکہ شوہر کی فیاضی اور ایثار

کی تعریف کی، رہ گئے، لال صاحب، اس نے جب دیکھا۔ کہ اصطبل سے گھوڑے نکلے جاتے ہیں۔ ہاتھی مکن پور کے میلے میں بکنے کے لیے بھیج دیئے گئے۔ کہار برخاست کیے جا رہے ہیں۔ تو گھبرایا ہوا کنور صاحب کے پاس آکر بولا "بابو جی! یہ سب آدمی گھوڑے ہاتھی کہاں جا رہے ہیں"۔

کنور صاحب زہر خند سے بولے۔ "یہ ایک راجہ صاحب کے نوید میں شریک ہوتے جا رہے ہیں"۔

لال صاحب۔ کون سے راجہ ہیں؟

کنور۔ ان کا نام راجہ غریب سنگھ۔

لال صاحب۔ کہاں رہتے ہیں؟

کنور۔ بے کس گنج ہیں۔

لال صاحب۔ تو ہم بھی جائیں گے۔

کنور۔ تمہیں بھی لے چلیں گے۔ مگر اس بارات میں پیدل چلنے والوں کی عزت سواروں سے زیادہ ہوگی۔

لال صاحب۔ تو ہم بھی پیدل چلیں گے۔

کنور۔ وہاں محنتی آدمی کی تعریف ہوتی ہے۔

لال صاحب۔ تو ہم خوب محنت کریں گے۔

کنور صاحب کے دونوں بھائی پانچ پانچ ہزار روپیہ سالانہ وثیقہ لے کر الگ ہو گئے۔ کنور صاحب اپنے اور اپنے عیال کے لیے بمشکل تمام ایک ہزار روپیہ سالانہ کا انتظام کر سکے۔ مگر یہ رقم ایک رئیس کی شان اور وقار کے لیے کسی طرح کافی نہیں

ہے۔ حاجتمند لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ سادھو سنت بھی دو چار ہمیشہ پڑے رہتے ہیں۔ ان سب کی خاطر کرنی پڑتی ہے۔ بڑی مشکل سے گزر ہوتی ہے۔ ادھر ایک سال سے شیوداس کے خاندان کا بار بھی سر پر آپڑا ہے۔ مگر کنور صاحب کبھی اپنے فیصلہ پر افسوس نہیں کرتے۔ انہیں کبھی کسی نے ملول نہیں دیکھا۔ ان کا چہرہ مردانہ قناعت اور غرور صادق سے منور نظر آتا ہے۔ ادبیات کا شوق پہلے ہی سے تھا۔ اب باغبانی سے الفت ہو گئی ہے۔ اپنے باغ میں صبح اور شام پودوں کی دیکھ بھال کیا کرتے ہیں۔ اور لال صاحب تو پکے کسان ہوتے نظر آتے ہیں۔ ابھی نو دس سال سے زیادہ عمر نہیں ہے۔ لیکن منہ اندھیرے کھیتوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی بھی سدھ نہیں رہتی۔ ان کا گھوڑا موجود ہے۔ مگر ہفتوں اس پر سوار نہیں ہوتے۔ ان کی یہ دھن دیکھ کر کنور صاحب بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور کہا کرتے ہیں۔ "اب میں ریاست کے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہوں۔ لال صاحب اس سبق کو کبھی فراموش نہ کریں گے۔ گھر میں دولت رہتی تو عیش اور شکار اور شرارت کے سوا اور کیا سوجھتی؟ دولت بیچ کر ہم نے محنت اور قناعت خریدی۔ اور یہ سودا برا نہیں ہے۔" مگر ساوتری اتنی قانع نہیں۔ وہ کنور صاحب کی ممانعت کے باوجود اسامیوں سے چھوٹے موٹے تحفے لے لیا کرتی ہے۔ اور خاندان کے رعب میں فرق نہیں آنے دیتی۔

ایمان کا فیصلہ

کان پور کے ضلع میں پنڈت بھرگودت مصر ایک بڑے زمیندار تھے۔ منشی ست نرائن لعل اِن کے مختار عام تھے۔ ساری ریاست کا سیاہ و سفید ان کے ہاتھ میں تھا۔ بڑے آقا پرست متدین آدمی تھے۔ لاکھوں روپیہ کا تحصیل وصول اور ہزاروں من غلّہ کا لین دین انجام دیتے تھے۔ اور سارا انتظام اس خوبصورتی سے کرتے۔ کہ ریاست روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ ایسے وفا کیش ملازم کی جتنی عزت ہونی چاہیے تھی، وہ ہوتی تھی۔ شادی و غم کی ہر ایک تقریب میں پنڈت جی بڑی سیر چشمی سے پیش آتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان پر اتنا اعتبار ہو گیا۔ کہ کاغذات کا سمجھنا بھی ترک کر دیا۔ خانگی مصارف کا حساب تک منشی جی کے ذمہ کر دیا گیا۔ اسی اثنا میں پنڈت جی مرگ بے ہنگام کے شکار ہوئے۔ گنگا نہانے گئے تھے۔ معلوم نہیں کسی گڑھے میں پھسل پڑے۔

یا کوئی جانور کھینچ لے گیا۔ اس کا پھر پتہ نہ چلا۔

اب منشی ست نرائن لال کے اختیارات اور بھی وسیع ہوئے۔ بجز ایک بیوہ عورت اور دو تین چھوٹے چھوٹے بچوں کے خاندان میں اور کوئی نہ تھا۔ مراسم وفات سے فرصت پانے کے بعد ایک روز بدنصیب بھان کنور نے انہیں بلایا۔ اور رو کر بولی۔ "لالہ، سوامی جی تو ہمیں منجھدار میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب ڈونگا تمہیں پار لگاؤ تو لگ سکتا ہے، یہ سب کھیتی تمہاری لگائی ہوئی ہے۔ اسے تمہارے اوپر چھوڑتی ہوں۔ یہ تمہارے بچے ہیں۔ ان کا منہ دیکھو۔ جب تک تمہارے مالک جئے تمہیں اپنا بھائی سمجھتے رہے۔ مجھے بشواس ہے کہ تم اس طرح اس بوجھ کو سنبھالے رہو گے۔"

ست نرائن لال نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "بھابی! بھیّا کیا اٹھ گئے میری تقدیر پھوٹ گئی۔ نہیں تو مجھے آدمی بنا دیتے۔ میں انہیں کا جلایا ہوا جیا ہوں۔ اور انہیں کی چاکری میں مروں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ کسی طرح اندیشہ نہ کریں۔ میں مرتے دم تک آپ کا حق نمک ادا کروں گا۔ آپ صرف اتنا کیجیے گا۔ کہ میں جس کارندہ یا ملازم کی آپ سے شکایت کروں۔ اس کی تنبیہہ ضرور کر دیجیے گا۔ ورنہ یہ لوگ شیر ہو جائیں گے۔

(۲)

اس حادثہ کے بعد کئی سال تک منشی ست نرائن لال نے اس ریاست کو سنبھالا۔ کبھی کسی معاملہ میں ایک کوڑی کا بل نہیں پڑا۔ سارے ضلع میں انہیں کا رسوخ تھا۔ لوگ پنڈت جی مرحوم کو بھول سے گئے۔ درباروں میں، کمیٹیوں میں انہیں کو دعوت ملتی۔ حکام ضلع ان سے اس طرح پیش آتے۔ گویا وہ زمیندار ہیں۔ ضلع کے دیگر رؤسا ان کا ادب اور لحاظ کرتے۔ مگر روز افزوں وقار اور رسوم کے ساتھ مصارف بھی

بڑھتے جاتے تھے۔ اور بھائی کنور دوسری عورتوں کی طرح جز رس تھی۔ انسانی طبائع کی پیچیدگیوں سے واقف نہ تھی۔ پنڈت جی مرحوم ہمیشہ انہیں انعام واکرام عطا کرتے رہتے تھے اور عنایات کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ روحانی طاقت کے بعد ایمان کا دوسرا ستون خارج البالی ہے۔ اس کے سوا وہ خود کبھی کبھی کاغذات کی جانچ کر لیا کرتے تھے۔ برائے نام ہی سہی۔ مگر اس سے نگرانی کا خوف بنا رہتا تھا۔ کیونکہ طبعی خیانت کے بعد ایمان کا سب سے بڑا دشمن موقع ہے۔ بھان کنور یہ چٹکلے نہ جانتی تھی۔ موقع اور احتیاج جیسے مہلک دشمنوں کے نرغہ میں پڑ کر منشی کی دیانت کیوں کر جانبر ہو سکتی تھی؟

کان پور شہر سے متصل ایک بہت آباد اور زرخیز موقع تھا۔ عین گنگا کے کنارے، پنڈت جی اس گاؤں کی حسرت لیے ہوئے دنیا سے کوچ کر گئے۔ پختہ گھاٹ اور مندر اور باغ اور بنگلہ کی آرزو دل ہی دل میں رہی۔ اتفاق سے اب یہ موضع بیع ہوا۔ اس کے زمیندار ایک ٹھاکر صاحب تھے۔ کسی فوجداری کے معاملہ میں ماخوذ ہو گئے تھے۔ مقدمہ کی پیروی کے لیے زرِ نقد کی اشد ضرورت تھی۔ منشی جی اپنے منصبی فرائض کے سلسلہ میں کچہری گئے ہوئے تھے۔ ٹھاکر صاحب نے اس کا ذکر کیا، منشی جی کو منہ مانگی مراد ملی۔ اسی وقت مول تول ہوا۔ بیعنامہ لکھا گیا، رجسٹری ہوئی، داخل خارج کی درخواست پیش ہو گئی۔ گو روپے موجود نہ تھے۔ مگر شہر میں ساکھ تھی۔ ایک مہاجن سے رقعہ لکھ کر بیس ہزار روپے منگوائے۔ اور ٹھاکر صاحب کے نذر کیے۔ ہاں سہولت کے خیال سے یہ سب معاملہ اپنے ہی نام سے طے کیا۔ کیونکہ نابالغوں کے نام سے بیع کرانے میں قانونی پیچیدگیاں پیدا ہوتیں۔ اور تاخیر سے شکار ہاتھ سے نکل جاتا۔

منشی جی اس دن خوش خوش بیعنامہ لیے ہوئے بھان کنور کے پاس آئے۔ پیر ذہ کرایا۔ اور جا کر یہ مژدہ جانفزا سنایا۔ بھان کنور نے آنسوؤں سے شکریہ ادا کیا۔ پنڈت جی کے نام پر پختہ گھاٹ مندر اور بنگلہ بنوانے کی یاد تازہ ہو گئی۔ منشی ست نرائن لال دوسرے دن اس موضع میں گئے۔ اسامی حاضر ہوئے۔ نذریں گزریں۔ ایک پرتکلف دعوت دی گئی۔ حکام اور رؤسائے شہر مدعو ہوئے۔ اور کشتیوں کی خوب سیر رہی۔

(۳)

حالانکہ اس موضع کو اپنے نام سے خریدتے وقت منشی کے دل میں دغا کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ لیکن دو ہی چار دنوں میں اس کے انکھوے نکل آئے۔ اس موضع کے آمد و خرچ کا حساب وہ علیحدہ لکھا کرتے۔ اور اسے اپنی مالکن کو سمجھانے کی مطلق ضرورت نہ سمجھتے۔ بھان کنور یوں بھی ان معاملات میں زیادہ دخل دینا مصلحت کے خلاف سمجھتی تھی۔ اس معاملہ میں بالخصوص اسے منشی کے جذبات کا بہت زیادہ لحاظ تھا۔ کہ کہیں انہیں یہ اندیشہ نہ ہو۔ کہ میں ان سے بدگمان ہوں۔

اس طرح کئی سال گزر گئے۔ اور اب رفتہ رفتہ دونوں فریق کے دلوں میں چور بیٹھا۔ بھان کنور کو خوف ہوا۔ کہ کہیں یہ سارے کا سارا موضع ہضم کرنے کی فکر میں تو نہیں ہیں۔ ادھر قانونی طاقت منشی جی کے اخلاقی احساس پر غالب آئی۔ انہوں نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ موضع میرا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بیس ہزار کا مقروض ہوں۔ کوئی بہت کرے گا۔ اپنے روپے لے لے گا۔ اس کے سوا کوئی کیا کر سکتا ہے؟ مگر یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ منشی جی پیش قدمی کے انتظار میں مسلح بیٹھے تھے۔

اور بھان کنور موقع کی منتظر تھی۔ ہاں تیر و تفنگ سے محترز رہنا چاہتی تھی۔

ایک روز اس منشی جی کو اندر بلا کر کہا۔ لالہ جی۔ یہ گداییں مندر کا کام کب سے شروع ہوگا۔ اسے لیے ہوئے آٹھ سال ہو گئے۔ اب کام لگ جائے تو اچھا ہو۔ زندگی کا کیا اعتبار، جو کام کرنا ہے۔ اسے کر ہی ڈالنا چاہیئے"۔

حملہ کا آغاز نہایت خوش اسلوبی سے ہوا۔ منشی جی بھی دل میں اس کے قائل ہو گئے۔ مگر موقع کی زمین نہیں ملتی۔ گنگا کے کنارے کی ساری زمین آسامیوں کی جوت میں ہے۔ اور وہ اسے کسی طرح چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے"۔

بھان کنور۔ "یہ بات تو مجھے آج معلوم ہوئی۔ آٹھ سال ہوئے اس گاؤں کا آپ نے کبھی بھولے سے بھی تو ذکر نہیں کیا۔ معلوم نہیں کتنی تحصیل ہے۔ کتنا منافع، کیسا گاؤں ہے، کچھ سیر ہوتی ہے یا نہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں، آپ ہی کرتے ہیں۔ اور کریں گے۔ لیکن کچھ مجھے بھی تو معلوم ہونا چاہیئے"۔ منشی جی سنبھل بیٹھے۔ مبارزانہ پیش قدمی شروع ہو گئی۔ بولے "آپ کو اس سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اس لیے میں نے خواہ مخواہ آپ کو دق کرنا مناسب نہ سمجھا۔

بھان کنور کو سکتہ سا ہو گیا پردہ سے باہر ہو گئی۔ اور منشی جی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ آپ نے گاؤں میرے لیے لیا تھا یا اپنے لیے۔ روپیہ میں نے دیا یا آپ نے؟ اس پر جو خرچ پڑا، وہ میرا یا آپ کا؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ اس وقت ہوش میں ہیں"۔

ست نرائن لال نے سن کر جواب دیا۔ "یہ تو آپ جانتی ہی ہیں۔ کہ موضع میرے نام سے بیع ہوا۔ روپیہ ضرور آپ کا لگا، مگر اس کا میں دین دار ہوں رہا تحصیل

وصول کا خرچ، یہ سب میں نے ہمیشہ اپنی جیب سے کیا ہے۔ اس کا حساب کتاب آمد و خرچ ہمیشہ الگ رکھتا گیا ہوں۔"

بھان کنور نے غصہ سے بل کھا کر کہا۔ "اس وفا کا پھل آپ کو ضرور ملے گا۔ آپ اس طرح میرے بچوں کا گلا نہیں کاٹ سکتے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ نے پیٹ میں یہ چھری چھپا رکھی ہے۔ نہیں تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟ خیر اب سے میرا رد کڑ اور کاغذات آپ کچھ نہ چھوئیں، میرا جو کچھ ہوگا۔ میں آپ سے لوں گی۔" یہ کہہ کر بھان کنور پھر پردہ کی آڑ میں آ بیٹھی۔ لالہ صاحب کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ خفیف ہو کر وہاں سے اٹھ آئے۔ اور دفتر میں جا کر کچھ کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگے مگر بھانکنور ان کے پیچھے پیچھے مردانے میں چلی آئی اور ڈانٹ کر بولی۔ میرا کوئی کاغذ مت چھونا، نہ برا ہوگا۔ تم زہر بھرے ہوئے سانپ ہو۔ میں تمہارا منہ دیکھنا نہیں چاہتی۔"

لالہ صاحب کاغذوں میں کچھ ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ خزانہ کی کنجی نکال کر پھینک دی۔ بہی کھاتے پٹک دیئے۔ کواڑ دھڑاکے کے ساتھ بند کیا۔ اور ہوا کی طرح سن سے باہر نکل گئے۔

دوسرے مختاروں کارندوں نے یہ کیفیت سنی۔ تو پھولے نہ سمائے۔ منشی ہت نرائن کے سامنے ان کی دال نہ گلنے پاتی تھی۔ اگر لوگ یہ تیل چھڑکنے لگے۔ "نمک عجیب چیز ہے۔ پھوٹ پھوٹ کر نکلے گا۔"

طرفین سے مقدمہ بازی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ایک طرف قانون کا قالب تھا دوسری جانب قانون کی روح۔ مادہ کو روح سے پیکار کرنے کا حوصلہ ہوا تھا۔

بھان کنور نے منشی جی چھکن لال سے پوچھا۔ "ہمارا وکیل کون ہے؟"

چھکن لال نے ادھر ادھر جھانک کر کہا۔ "وکیل تو سیٹھ جی تھے۔ مگر ست نرائن لال نے انہیں پہلے ہی گانٹھ رکھا ہے۔ اس مقدمہ کے لیے بہت ہوشیار آدمی درکار ہے۔ مہرا بابو کی آجکل خوب چل رہی ہے۔ حاکموں کے قلم پکڑ لیتے ہیں۔ بولتے ہیں تو جیسے موٹر کار چھوٹ گیا۔ حضور اور کیا کہوں۔ مجرموں کو پھانسی سے اتار لیا ہے۔ ان کے سامنے کوئی وکیل تو زبان کھول ہی نہیں سکتا۔ حضور فرمائیں۔ تو انہیں کو کر لیا جائے؟"

اس طولانی تمہید کا اثر کچھ نہ ہوا۔ بھان کنور نے کہا "پہلے سیٹھ جی سے پوچھ لیا جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ آپ جائیے اور انہیں بلا لائیے۔ چھکن لال نے زیادہ حیل وحجت نہیں کی۔ سیٹھ جی کے پاس جاکر پیغام دیا۔ سیٹھ جی پنڈت بھرگودت کے زمانہ سے یہاں کے قانونی مشیر تھے۔ مقدمہ کی کیفیت سنی تو حیرت میں آگئے۔ ست نرائن لال کو وہ نیک نیت آدمی سمجھتے تھے۔ اسی وقت آئے۔ بھان کنور نے خود ان سے مقدمہ کی روداد بیان کی۔ اور ان پر اپنے بچوں کے بہت حقوق جتانے کے بعد اس معاملے کو فوراً ہاتھ میں لینے کی استدعا کی۔ سیٹھ جی نے باہمی مصالحت کا ذکر کیا بھان کنور پھر پردہ کے باہر نکل آئی، اور بولی نہیں کبھی نہیں۔ میں صلح نہ کروں گی آپ کاغذات دیکھیں۔ میرے بچوں کی خاطر تکلیف اٹھائیں۔ ست نرائن کی نیت پہلے خراب نہ تھی۔ تھوڑے دنوں سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ دیکھئے جس تاریخ کو گاؤں بیع ہوا تھا۔ اس مہتی میں ۳۲ ہزار کا خرچ دکھایا گیا ہے۔ اس نے اپنے نام قرض لکھا ہو تو دیکھئے۔ سالانہ سود ادا ہوا یا نہیں۔ ایسے دغاباز آدمی سے میں صلح کروں گی؟"